بہاولپور کے آثار قدیمہ

ڈاکٹر سیّد آصف علی رضوی

تاریخی اور جغرافیائی ہر دو لحاظ سے بہاولپور کو پنجاب کے دوسرے ڈویژنوں کے مقابلہ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ برطانوی ہندوستان میں شامل بہاولپور مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست تھی اور پاکستان میں شامل ہونے والی سب سے بڑی ریاست ہے[1]۔ یہ ریاست چمکتے ہوئے لق ودق صحرا جو سحور کن سرابوں کے ساتھ ساتھ سرسبز نخلستان اور شاداب کھیتوں کی سرزمین ہے۔ جسکی عظمت دیرینہ کے نشانات گھا گھرا کے خشک پاٹ کے کنارے قلعہ ڈیراور، مروٹ اور فورٹ عباس کے کھنڈرات ہیں۔ نیز جانڈا، کھانڈا، پھول ڈورہ، پتن منارہ، سوئی وھار اور سرواہی کے آثارات عالمی انسانی ورثہ قرار دینے کے مستحق ہیں۔ علم وعرفان، فنون وحکمت اور دانش وآگہی کی روایات کے لحاظ سے سرزمین بہاولپور، عہد عتیق سے ہی درخشندہ روایات کی امین رہی ہے۔ یہاں ہندومت کی عظیم عبادت گاہیں بھی تھیں اور بدھ مت کی عالمی شہرت کی حامل درس گاہیں بھی، طلوع اسلام کے بعد اسی خطے میں واقع اُچ اولین اسلامی علوم کا مرکز بنا اور صدیوں تک نسل انسانی کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہا[2]۔

بہاولپور کا بطور ریاست قیام ۱۷۲۷ء میں عمل میں آیا اور امیر صادق محمد خان اس کے پہلے حکمران قرار پائے۔ جنکا تعلق بغداد کے خلفائے عباسیہ سے تھا۔ اس خاندان کے افراد کا قیام بغداد سے ہجرت کے بعد مختلف ادوار میں سندھ پنجاب اور بلوچستان کے اضلاع میں رہا۔ جبکہ بلوچستان کے علاقے مکران میں انکی حیثیت مذہبی پیشواؤں کی تھی۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر جیمز برنز کا کہنا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں جن دو مذہبی رہنماؤں نے دریائے سندھ کے کنارے آباد مکینوں کی سیاست پر قبضہ کیا ان میں ایک آدم شاہ کلہوڑہ عباسی اور دوسرے سکھوں کے مرشد نانا صاحب تھے۔ آدم شاہ نے زیریں اور بالائی سندھ میں سیاست کی افراتفری کا فائدہ اٹھایا اور وہاں کے حکمران بن گئے[3]۔ یہ وہ دور ہے جب ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کیا۔

ڈاکٹر جیمز برنز کے مطابق اس دوران انکو شہنشاہ اورنگ زیب سے ٹھٹھہ کی حکمرانی کا پروانہ بھی مل گیا[4]۔ بعد ازاں عظیم مغل حکمرانوں کی باہمی اقتدار کی جنگ کے اثرات اس خاندان میں بھی نفوذ کر گئے اور عباسی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ نتیجتاً امیر کلہوڑہ کی اولاد علاقہ سندھ پر قابض ہوگئی اور امیر داؤد خان کی اولاد سندھ سے نقل مکانی کر کے موجودہ بہاولپور کی حدود میں آگئی اور ایک ریاست کی بنا ڈالی جو ستمبر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کی تشکیل کے وقت ایک معاہدے کے ذریعے وحدت مغربی پاکستان میں بہاولپور ڈویژن کے نام سے مدغم ہوگئی۔ صوبہ پنجاب میں واقع

بہاولپور ڈویژن ۲/۱ ۲۷ ڈگری شمالی عرض بلد سے لے کر تقریباً ۲/۱-۳۰ ڈگری عرض بلد تک اور ۶۹ ڈگری مشرقی بلد سے ۷۴ ڈگری مشرقی طول بلد تک غرباً تقریباً ۴۵۰ کلومیٹر طویل اور وسط میں شمالاً جنوباً پنجند سے لے کر اسلام گڑھ تک تقریباً ۱۷۵ کلومیٹر عرض میں پھیلا ہوا ہے[۵]۔ چنانچہ نقشہ پر اسکی شکل مشکیزہ نما نظر آتی ہے۔ شمال میں اسکی سرحد دریائے ستلج و پنجند و سندھ سے متعین ہوتی ہے جو ملتان اور ڈیرہ غازی خان ڈویژنوں کو اس سے جدا کرتی ہے۔ جبکہ صوبہ سندھ کا سکھر ڈویژن اس کے عین مغرب میں ہے اور جنوبی جانب پاک و ہند کی بین الاقوامی سرحد کا نصف چھ کلومیٹر حصہ واقع ہے۔ جو بھارت کے علاقہ راجستان اور مشرقی پنجاب کو پاکستان سے جدا کرتا ہے اور قومی دفاع و عسکری اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ چودہ تحصیلوں اور تین اضلاع بھاولنگر، بہاولپور اور رحیم یار خان پر مشتمل اسکا کل رقبہ ۴۵،۵۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور اس طرح بہ لحاظ رقبہ بہاولپور پنجاب کا سب سے بڑا ڈویژن ہے[۶]۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۶۹۰۰۰۰۰ تھی جس کا ۱۹۹۲ء کا تخمینہ ۶۸۶۲۳۰۰۰ نفوس لگایا گیا ہے۔ آبادی کا تقریباً ۸۰ فی صد دیہاتوں میں آباد ہے۔ سال ۱۹۶۱ء سے سال ۱۹۸۱ء تک کی آبادی کی اعداد و شمار کے موازنہ سے شرح آبادی کا اندازہ ایک لاکھ نفوس لگایا گیا ہے۔ لیکن گزشتہ دس گیارہ برسوں میں اس میں غیر معمولی اضافہ تقریباً دو لاکھ چھبیس ہزار نفوس کی رفتار سے ہوا ہے۔ جس کے مطابق اس وقت کل آبادی تقریباً ۶۹ لاکھ ہوگی[۷]۔ بہاولپور ڈویژن کی سطح کا بیشتر حصہ دریائے سندھ کے طاس کا وسطی میدانی علاقہ ہے جو سطح سمندر سے عموماً ۱۵۰ میٹر سے زیادہ بلند نہیں ہے البتہ جنوب مغربی صحرائی علاقہ میں جس کو مقامی زبان میں روہی چولستان کہتے ہیں ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں نے ہموار سطح کو غیر سطح نشیب و فراز میں تبدیل کر دیا ہے۔ جس کی بلندی ڈیڑھ سو میٹر سے تجاوز کر جاتی ہے۔

سطح کے حوالے سے بہاولپور ڈویژن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی شمالی حصہ جو دریائے ستلج کا سیلابی کنارہ ہے یہاں دریا برد زرخیز سیلابی خاک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ پرانی آبادی کا علاقہ ہے اس علاقے کو مقامی زبان میں ادتار بھی کہتے ہیں۔ سطح کے لحاظ سے دوسرا حصہ ریلوے لائن اور گزرگاہ ھاکڑہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ جو عموماً صحرائی ریت اور چکنی مٹی کے سخت میدانوں پر مشتمل ہے۔ سیلابی خاک کے علاوہ ہوا بردہ صحرائی ریت اس کی سطح کے خاص اجزاء ہیں۔ مقامی زبان میں اس علاقہ کو ھشھار کہتے ہیں۔ یہ لحاظ سطح بہاولپور کا تقریباً دو تہائی جنوبی حصہ صحرائے راجپوتانہ کا شمالی حصہ ہے جہاں ریت کے بڑے بڑے متحرک ٹیلے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے شمالی جانب ویدک زمانہ کے ایک مشہور دریا سرسوتی کی پرانی گزرگاہ کے نشانات ملتے ہیں۔ اس کے ویدک نام سرسوتی کے علاوہ اب اسکو دریائے ھاکڑہ یا دریائے گھاگرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آج بھی یہ ایک برساتی ندی کی شکل میں بھارت کے علاقہ بیکانیر میں داخل ہوتا ہے جبکہ بعض اوقات اسکا پانی بہاولپور میں داخل ہو جاتا ہے۔ جو ضلع بھاولنگر کی نو

آبادیوں کو متاثر کرتا ہے[۸]۔

بہاولپور ڈویژن مجموعی طور پر نیم صحرائی گرم خشک آب و ہوا کا حامل ہے۔ ماہ مارچ سے اکتوبر تک تقریباً آٹھ ماہ موسم گرم رہتا ہے، البتہ نومبر سے فروری تک موسم نسبتاً سرد اور خوشگوار ہوتا ہے۔ موسم گرما میں اوسط درجہ ۳۰ تا ۳۵ ڈگری سینٹی گریڈ اور موسم سرما میں ۱۰ سے ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا ہے جبکہ اوسط سالانہ درجہ حرارت ۲۴ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۲۶ ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے[۹]۔ دن اور رات میں درجہ حرارت میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ موسم سرما میں رات کے وقت بعض اوقات درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے اور پالا پڑ جانے کا باعث بنتا ہے۔ جس سے فصلیں خراب ہو جاتی ہیں جبکہ جون اور جولائی کے مہینوں میں دن کے وقت تمازت آفتاب میدان حشر بپا کرتی ہے جبکہ فورٹ عباس اور خان پور کا درجہ حرارت بعض اوقات ۴۵ ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز ہو کر جیکب آباد کے ہم پلہ ہو جاتا ہے اور آندھیوں کا باعث بنتا ہے۔ جہاں تک بارش کا تعلق ہے سالانہ اوسط ۱۰ سے ۲۵ سینٹی میٹر سے زائد کہیں نہیں ہے۔ موسم گرما میں اوسط بارش ۲۰ سینٹی میٹر اور موسم سرما میں صرف ۵ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینوں کا موسم برسات کا ہوتا ہے، جبکہ شمالی پنجاب سے آنے والی بچی کھچی مون سون ہوائیں کبھی کبھی اس علاقہ کے کم دباؤ کی طرف چلی آتی ہیں اور بارش برساتی ہیں۔ شمال مشرق سے جنوب کی سمت قلت باران بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے صحرائے چولستان میں واقع بعض مقامات ایسے بھی ہیں جو سال ہا سال قطرہ باراں کو ترس جاتے ہیں۔ یہ علاقہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے سے متمدن اور تہذیب یافتہ تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں پانچ ہزار سال پہلے کی ھاکڑہ تہذیب کے نشانات ملتے ہیں۔ جو موہن جوداڑو اور ہڑپہ کے دور سے بھی قبل کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ڈویژن کے اٹھارہ ہزار مربع میل رقبہ میں تقریباً دو تہائی لق و دق صحرا ہے۔ جس کو چولستان کہا جاتا ہے لفظ چولستان دراصل ترکی لفظ چیلستان ہے۔ جس سے مراد صحرائے بے آب کے ہیں۔ اس میں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ جو صحرائے اعظم کی سو تمازت کی ہمسری کرتی ہے۔ باد سموم ہر چیز کو جھلسا دیتی ہے اور تند و تیز ریت کے تودے دور دور تک منتقل کر جاتی ہے۔ سالانہ برسات برائے نام یعنی (تین انچ) ہوتی ہے۔ مگر ہزاروں سال پہلے یہ سرزمین دریاؤں کے مدوجزر کی تماشہ گاہ اور موج ہائے تلاطم کی جولانگاہ رہی ہے۔ یہاں گھنے جنگلات اور سرسبز چراگاہیں تھیں اور ہر طرف فصلوں کے کھیت اور کھلیان نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں تقریباً ۳۰ فیصد سالانہ بارش ہوا کرتی تھی[۱۰]۔

خطہ بہاولپور اپنی تاریخی و جغرافیائی اہمیت کے اعتبار سے سیاحوں کے لئے بھی ہمیشہ وجہ کشش رہا ہے اور ایسے مشہور زمانہ سیاح جنھوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں کی سیاحت کی ہے انہوں نے اس خطے میں بھی قدم رکھے ہیں اور یہاں کے ثقافتی معاشی اور سیاسی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے تاثرات کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔

ان سیاحوں کی بہاولپور میں آمد کا سلسلہ قبل از مسیح سے شروع ہو کر زمانہ حال تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلا سیاح جو یہاں آیا وہ نرجیس تھا۔ جو سکندر اعظم کا درباری تھا۔ جس نے اس خطے میں سکندر مقدونی کی فتوحات کا ذکر اپنے سفر نامہ میں کیا ہے۔ جس جگہ سکندر اعظم نے قیام کیا تھا یہ جگہ اوچ شریف تھی۔ جس کا نام اس نے اپنے نام پر سکندریہ رکھا تھا[11]۔ اس کے بعد جس مشہور سیاح کی آمد کا پتہ چلتا ہے وہ چینی سیاح ھیون سانگ ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں اس علاقے کی سیاحت کرتا ہے[12]۔ سعیدی علی بن حسین ایک ترکی سیاح تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ ملاح بھی تھا، شاعر بھی، مورخ بھی اور سپاہی اور جغرافیہ دان بھی۔ اس کی سندھ، پنجاب، افغانستان، خراسان، ایران کی سیاحت چار برسوں کے عرصے پر محیط ہے۔ اس نے اپنے سفر کی روداد *مراۃ الممالک* میں درج کی ہے۔ جس میں وہ اس علاقے کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے[13] اور تاریخ اسلام کا نہیں بلکہ عالمی سطح پر شہرت دوام حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ تاریخ اسلام نہیں بلکہ عالمی سطح پر شہرت دوام حاصل کرنے والا ابوعبداللہ محمد المعروف ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری میں سندھ سے ہوتا ہوا اوچ آیا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے بکھر سے چل کر ہم اوچ میں پہنچے یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے پر آباد ہے اور بڑا شہر ہے۔ بازار بہت عمدہ اور عمارتیں بہت مضبوط ہیں۔ میں اوچ میں حضرت جلال الدین حیدر علوی مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے بھی ملا جنھوں نے مجھے خرقہ عطا کیا[14]۔

مذکورہ بالا سیاح اس زمانے میں آئے جب ریاست بہاولپور کی بنیاد نہیں پڑی تھی، اس لئے ریاست کے معاشی ومعاشرتی اور مذہبی حالات پر زیادہ روشنی نہیں پڑی۔ البتہ ان کے بعد جو انگریز سیاح وقتاً فوقتاً بہاولپور آئے ان کے سفر نامے کافی جاندار اور مفصل ہیں۔ ان سیاحوں میں ایک بہت ہی معتبر سیاح چارلس مین تھا[15] جس نے بہاولپور کا دورہ کیا۔ یہ اینگلو انڈین تھا اور یہ بھلوہ، جام گڑھ، میر گڑھ اور موج گڑھ سے ہوتا ہوا بہاولپور پہنچا۔ یہ خود لکھتا ہے ایشیا میں بہت کم ایسے علاقے ہیں جہاں کی پیداواری چیزیں اتنی وافر اور سستی ہیں جتنی بہاولپور میں[16]۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ دریائے گھارا کی موجودگی نے اس علاقے کو بہت ذرخیز بنا دیا ہے۔ بہاولپور کے بارے میں وہ بتاتا ہے کہ دریائے گھارا سے یہ شہر دو میل کے فاصلے پر آباد ہے اور یہاں کے مکانات پکی اینٹوں سے تعمیر شدہ ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ باغات پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً کھجوروں اور پیپل کے درخت۔ اوچ کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ یہ اس علاقے کا قدیم ترین قصبہ ہے۔ یہ شہر دو ناموں سے موسوم ہے۔ ان میں سے ایک 'پیر کا اوچ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس نام کی وجہ میر ناصر الدین ہیں جو خان آف بہاولپور کے روحانی پیشوا ہیں[17]۔ لیفٹیننٹ آرتھر کنالی ۱۸۳۸ء میں آیا۔ اس نے بہاولپور کے متعلق اپنے سفر کے حالات اپنی مشہور کتاب کی جلد دوم میں بیان کئے ہیں۔ وہ روھڑی سے ہو کر بہاولپور پہنچا۔ وہ لکھتا ہے کہ، جونہی ہم بہاولپور کے علاقے میں داخل ہوئے تو ہمیں کافی خوشحالی نظر آئی۔ کاشتکاری

بہتر تھی۔ گندم فراواں، لوگ مہذب، اور نظم وضبط کے تابع معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خان (نواب صاحب) کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں[۱۸]۔ ماونٹ اسٹوارٹ ۱۸۰۸ء میں نواب بھاول خان دوم کے عہد میں آیا۔ بہاولپور گزیٹیئر میں اس سیاح کے بارے میں لکھا ہے کہ مسٹر اسٹوارٹ ۱۸۰۸ء میں نواب بھاول خان دوم کے عہد میں کابل جاتے ہوئے بہاولپور ٹھہرے اور نواب صاحب نے انکی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تعلقات ایک معاہدے کے ذریعے برطانوی حکومت سے استوار کئے۔ اس سفرنامے کی قابل تعریف بات یہ ہے کہ ان کے سفرنامے کے تاریخی شواہد بہت مضبوط ہیں اور ان کا تجزیہ بہت حقیقت پسندانہ ہے۔ اس کے باوجود کہ اتنے سال گذر گئے ان کی تحریر کے حقائق کو اب تک جھٹلایا نہیں جاسکا۔ اس وقت کے بہترین تاریخ دانوں میجر راورٹی وغیرہ نے اس سفرنامے کی تعریف کی ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کو سراہا ہے[۱۹]۔ لیفٹیننٹ کرنل سر الگزینڈر برنیز بھی بہاولپور کا ایک اہم سیاح ہے اس نے اپنے سفر نامے کو تین جلدوں میں مرتب کیا[۲۰]۔

لیفٹیننٹ اے۔ ایچ۔ بولیو نامی سیاح بہاولپور میں ۱۸۳۵ء میں آیا۔ اس کا سفرنامہ ۱۸۳۵ء کے نام سے ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔ وہ بہاولپور کے جن مقامات پر گیا ان میں اسلام گڑھ، خانپور، احمد پور، مٹھن کوٹ، اوچ، ڈیرا، بہاولپور موج گڑھ، غوث گڑھ اور رکن پور وغیرہ شامل ہیں[۲۱]۔ موہن لال کشمیری بہاولپور میں ۱۸۳۶ء میں آیا۔ وہ بہاولپور کا سیاح بھی ہے اور مورخ بھی، اس کے سفر کے تاثرات اور انکی یاداشتیں امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نئی دھلی اور پنجاب ریکارڈ آفس لاہور میں بھی محفوظ ہیں۔ بہاولپور کی تاریخ پر اس کے دو مضمون ہیں جو جرنل آف ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں نواب بہاولپور، ریاست کا قیام اور اوچ کے حالات بیان کئے گئے ہیں[۲۲]۔ ڈیوڈ راس بہاولپور کا ایک اور اہم سیاح ہے جو ۱۸ویں صدی میں یہاں آیا، اس نے پنجاب اور سندھ پر ایک معرکتہ الارا کتاب لکھی۔ سفرناموں میں یہ کتاب کلاسک کا درجہ رکھتی ہے اور آج بھی سند مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ بہاولپور کے بارے میں جو خاص باتیں اس نے لکھی ہیں ان میں چولستان کے ایک قدیم شہر کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ دجنوٹ (بجنوٹ) سندھ کے شہر برھمن آباد کا ہم عصر تھا۔ یہ وہی شہر ہے جسے مشہور چینی سیاح ھیوان سانگ نے مشن پولو کہا ہے اور یہ ساتویں صدی عیسوی میں صوبے کا دارالحکومت تھا۔ چولستان کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ چولستان کا تخلیقی سروے بہت کم کیا گیا ہے۔ وہاں بہت سے پرانے کھنڈر ہیں جن کے کنارے پر دریا بہتے تھے اور جو اب ریت سے ڈھک چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس خطے کی زیادہ چھان بین کی گئی تو یہاں آثار قدیمہ کے بے شمار جواہر پارے ملیں گے[۲۳]۔

میجر میکسین نے ۱۸۴۴ء میں بہاولپور کا دورہ کیا تھا۔ جس کا مقصد سرسہ سے لے کر بہاولپور تک تجارتی

مقاصد کے لئے اس راستے کی افادیت معلوم کرنا تھا۔ یہ وہی میجر میکیسن ہے جو کچھ عرصہ کے لئے بہاولپور کا پولیٹکل ایجنٹ بھی رہا اور جس کا ذکر منشی موہن کشمیری نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ میجر کی رپورٹ جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی میں شائع ہو چکی ہے [۲۴]۔ ان عظیم سیاحوں کے مشاہدات اور ماہرین تہذیب وتمدن اور آثار قدیمہ پر دسترس رکھنے والوں کی تحقیقات کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب ایک شہری تہذیب تھی جو آج سے چار ہزار سال قبل اپنے عروج پر تھی اور آج سے تقریباً ۵۰ سال پہلے سندھ میں واقع موہن جوڈارو اور پنجاب کے شہر ہڑپہ کے مقام پر کھدائی کرنے پر یہ تہذیب اہل علم وفکر پر آشکار ہوئی اور اس پہلو کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہا کہ کم از کم یہ تہذیب سندھ سے لے کر پنجاب کے شہر ہڑپہ تک پھیلی تھی جسکا قلب بہاولپور تھا۔ کیونکہ ماہرین تہذیب وتمدن کے نزدیک یہ امر ناممکن ہے کہ کسی بھی بلند پایہ تہذیب کے دو شہر ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور الگ الگ ارتقاء پذیر ہوں اور درمیانی علاقہ اس طاقتور تہذیب سے کلیتہً آزاد ہو۔ نیز ان شہروں کا تمدنی نظام، معاشرتی روایات اور طرز تعمیر سے یہ بات ثبوت کو پہنچی ہے کہ ان دونوں شہروں کی ہمہ جہتی ترقی ایک ہی تہذیب کی مرھون منت ہے جسکا قلب بہاولپور ہے۔ یہ دو شہر نہیں بلکہ اس قسم کے دو بازو ہیں جسکے وجود کی بہاولپور میں نمو ہوئی ہے۔ وہ تہذیب جسکی نمو بہاولپور میں ہوئی، اسکی ثقافت نہایت معیاری تھی۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو نہایت سلیقہ سے بسائے گئے تھے۔ پکی سڑکیں ایک دوسرے سے زاویہ قائمہ پر تھیں۔ نکاس آب کا نظام نہایت اعلیٰ درجہ پر تھا اور حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا تھا [۲۵]۔

قدیم صحائف اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ وادی سندھ ان علاقوں میں سے ہے جہاں انسانی تہذیب کی اولین نمو ہوئی۔ زرتشت کی مقدس کتاب ''اوستا'' میں لکھا ہے کہ ہرمزد نے انسان کی اولین آبادی کے لئے جس سرزمین کو پسند کیا وہ سات دریاؤں کی سرزمین تھی [۲۶]۔ یہ بات تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ سندھی تہذیب کے بعد آریائی تہذیب نے بھی اس علاقے میں جنم لیا اور دریاؤں کے سنگھم پر اس تہذیب کے بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ سات دریاؤں کی سرزمین جسکو سندھ کہا جاتا ہے، ان تین دریاؤں کے بڑے بڑے سنگھم بالعموم ان علاقوں میں واقع ہیں جو آجکل بہاولپور، ملتان ڈویژن میں واقع ہے۔ اس ضمن میں سپت سنھو کے ان دو دریاؤں کو جو خشک ہو چکے ہیں، میں ایک دریائے ھاکڑہ کی گزرگاہ کو مدنظر رکھا جائے تو یہ پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ آریا تہذیب کا مرکز بھی پنجاب کا یہی علاقہ تھا۔ تاریخ کے ابتدائی دور کی ورق گردانی سے بھی یہی حقیقت آشکار ہوئی ہے۔ سکندر اعظم کا حملہ ۳۲۶ ق۔م کا واقعہ ہے۔ اس نے ایشاء کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا جس میں پنجاب کا بالائی حصہ بھی شامل تھا۔ سکندر کے حملے کے وقت اس علاقے کی اہمیت ایک اور پہلو سے اجاگر ہوتی ہے کہ اچ سے آگے سکندر جب پتن منارا، (موجودہ رحیم یار خان)

میں داخل ہوا تو وہ اس علاقے کے حسن و جمال، انسانی بستیوں کے تمدنی ارتقائی مدارج اور انتظامیہ کے نظم و نسق سے اس حد تک متاثر ہوا کہ اس کے ہمرکاب یونانی اہل قلم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت یہ سرزمین دریاؤں کے مدوجزر کی تماش گاہ اور سوچ ہائے تلاطم کی جولانگاہ تھی، یہاں گھنے جنگلات، ذرخیز زمین اور وسیع و عریض چراہ گاہیں تھیں۔ چاروں طرف قیمتی فصلیں، نفع آور کھیت و کھلیان اور بڑے بڑے ریوڑ تھے اور سب سے بڑھکر گنجان آباد بستیاں تھیں جو شستہ انسانوں، فلاح و بہبود کے حامل معاشرتی نظاموں اور انسان دوست تہذیبوں سے مزین تھی [۲۷]۔

بہاولپور ڈویژن کے اٹھارہ ہزار مربع میل رقبہ میں سے دو تہائی لق و دق صحرا ہے جو بھارت کی سرحد راجھستان کے ساتھ متوازی چلا گیا ہے جسکو چولستان کہا جاتا ہے جو تر کی لفظ چیلستان سے اخذ ہوا ہے۔ یہ لفظ صحرائے بے آب و گیاہ کے لئے بولا جاتا ہے اسی جگہ تباہ شہروں، ماضی کی عظیم مہذب بستیوں اور بلند مرتبت انسانی تہذیبوں کے جا بجا نشانات ملتے ہیں۔ چنانچہ صحرائے چولستان میں مشرق کی طرف دلبر سے ڈیراوڑ تک مختلف مقامات پر ٹیلے ہیں۔ ان کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ راجہ واہن کا وطن تھا۔ مشہور محقق و جغرافیہ دان سر آرل لھیٹین نے ڈیراوڑ تک کے کھنڈرات کی تحقیق کے سلسلے میں جغرافیکل جرنل میں رائے دیتے ہوئے لکھا کہ خشک دریائے ھاکڑہ پر آثار قدیمہ وادی سندھ کی ہم عصر ہے۔ لیکن ھاکڑہ کے آثار قدیمہ ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ انگریز محققین مچن سر آرل سٹائن اطالوژ ڈاکٹر تاتوری، امریکی ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ھنری فیلڈ اور دو پاکستانی معتبر نام مراد شاہ گردیزی اور ڈاکٹر رفیق مغل نے بہاولپور کے خشک شدہ دریائے ھاکڑہ کی وادی میں قدیم گم شدہ تہذیبوں کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اہل علم تک پہنچانے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا جس کے نتیجے میں چار سو سے زائد ایسے مقامات کی تفصیلات ریکارڈ کی گئیں جنکا تعلق ۱۰۰۰۰ سے ۴۰۰۰ سال قبل مسیح کے زمانوں سے تھا۔ اس سروے کے دوران صحرائے چولستان میں گنوریوالہ کے مقام پر موہنجوداڑو جتنا وسیع و عریض اور اسی طرز پر بسائے ہوئے قدیم شہر کے آثار کو اجاگر کر کے محققین کو ایک نئی جہت دی نیز ہڑپہ کے رقبے کے مساوی دو نئے شہر جو دیراوڑ کے نزدیک تھے دریافت کئے [۲۸] اور اس طرح اس نظریے کو ثبوت فراہم کر دیا کہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں پروان چڑھنے والی تہذیب کا مرکز بہاولپور تھا۔

اس سروے کا مزید گہرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ چار سو مقامات میں سے کم و بیش تین سو مقامات اس تہذیب کے مختلف ارتقائی مدارج کی آئینہ دار ہیں۔ جن سے اس تہذیب کے ظہور، فروغ اور ارتقاء کو با آسانی سمجھا جا سکتا ہے، ۲۴۰ مقامات ایسے ہیں جو چار ہزار قبل مسیح کے زمانہ سے متعلق ہیں اور جنکی قدامت ڈھیری ضلع ڈیرہ اسماعیل خان سے بھی زیادہ ہے۔ ان اثرات کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ جمہور پسند تھا اور امن و

سکون کا گہوارا تھا کیونکہ جنگی آلات کا وجود نہیں ملا ''اناج گھروں'' کی موجودگی اعلی درجے کی زراعت کا مظہر ہے۔ بڑے بڑے جنگلات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ کیونکہ حاصل ہونے والی مہروں پر چیتا، گینڈا، ہاتھی اور زیبرا کی تصاویر ملی ہیں اس طرح مگر مچھ، کچھوا اور مچھلی کی شبیہ کی بھی مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ اس دور کے سنگ تراشی کے نمونے اعلی تمدن کے عکاس ہیں۔ دستیاب شدہ نمونوں کو ماہرین و محققین نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ رواجی یا تقلیدی جسکی بہترین مثال ریتیلے پتھر پر بنی ہوئی بادشاہ پرلسٹ اور رقاصہ دیوداسی کی مورتیاں ہیں جنکا سراغ ہڑپہ میں ملتا ہے۔

۲۔ یونانی اثرات سے متصف سنگ تراشی جو مختلف انسانی اور جانوروں کے مجسموں کی شکل میں دستیاب ہوئی[۲۹]۔

ہڑپائی تہذیب کے ان کھنڈرات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ مذکورہ تہذیب کے جنم سے لے کر عروج و زوال تک ہر مرحلے کے اثرات یہاں نظر آتے ہیں۔ کوٹ دیجی سے متعلق اثرات ابتدائی تمدن کے عکاس ہیں، یہاں چڑھانے کے لمبے اور چپٹی قسم کے سٹینڈز ذخیرہ کرنیوالے سرخ رنگ کے پتلے جسم والے جار وغیرہ[۳۰]۔ لیکن جب ڈیرادر کے شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف آبادیوں نے منتقل ہونا شروع کیا تو تمدن نے ارتقاء کی طرف تیزی سے بڑھنا شروع کیا، جسکا ثبوت تعداد، احاطے اور بلندی میں اضافہ سے ملتا ہے۔ اسی طرح ان آبادیوں میں صنعتی کالونیاں عام رہائشی آبادیوں سے دور اور ممتاز نظر آتی ہیں۔ نیز صنعت مٹی سے نکل کر دھاتی مصنوعات کی طرف ترقی کرتی گئی۔ بعد ازاں اسکی حد بندی بھی نظر آئی۔ چنانچہ ظروف اور مٹی کی مصنوعات کی کالونیاں نہ صرف رہائشی علاقوں سے ہٹ کر تھیں بلکہ مختلف صنعتوں کے زون بھی علیحدہ علیحدہ ہو گئے[۳۱] جسکو جدید طرز سمجھا جاتا ہے یہ نشانات جنوڈیرو، روھڑی اور لوتھل سے برآمد ہو چکی ہیں۔

ان کھنڈرات کے مشاہدات سے ایک اہم پہلو یہ بھی اجاگر ہوتا ہے کہ اس دور کی عبادت گاہوں پر کما حقہ روشنی نہیں پڑتی۔ اگر چہ بعد ازاں بدھ کے مجسمے ضرور نظر آتے ہیں اور تا حال انکا سلسلہ جاری ہے۔ سوئی دھار سے ایک مجسمہ جنوری ۱۹۷۲ء میں ملا جو ساڑھے سات انچ طویل، اور چار انچ موٹا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ہے جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ دھاری دھار ڈھیلا لباس اوت تسلی دینے کے لئے دایاں ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے اور گھنگھریالے بالوں کو کنگھی کر کے پیچھے کیا گیا ہے۔ مجسمے کے بائیں جانب درج حروف ایسے رسم الخط میں ہیں جو تقریباً ۵ ویں صدی عیسوی کے معلوم ہوتے ہیں۔ لفظوں کی تصویر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ساگھامیتیا ہے جسکے معنی ہیں ساگھا مٹی کا[۳۲]۔

صادق آباد کا قصبہ سنجر پور سے ڈیڑھ کلومیٹر دور ہڑپہ کے کنارے وادی ہاکڑہ کی قدیم ترین بستی کے نشانات ایک بلند ٹیلے کی شکل میں موجود ہیں۔ جس کو سرواہی کا نام دیا گیا ہے۔ کرنل مچن کی تحقیق اور کھدائی کے نتیجے میں قصبہ قائم پور سے مشرق کی سمت تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر کی باقیات سامنے آئیں یہ مقام اس قدر قدیم ہے کہ اس کے بارے میں اس سے قبل کسی محقق و مصنف نے قلم نہیں اٹھایا۔ بعد ازاں ۱۹۲۵ء میں یہاں بہاولپور کینال کی کھدائی کے دوران سکے بھی دستیاب ہوئے جو اس شہر کے متمدن ہونے کی گواہی ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے رپورٹ دی ہے کہ مذکورہ سکے مہاراجہ کشن کے عہد سے متعلق تھے [۳۳]، الغرض یہ شہر قدامت کے ساتھ اپنے متمدن ہونیکا بھی ثبوت رکھتا ہے۔

سر مورٹیمر وھلر اور سر آرل سٹائن کی علمی بصیرت نے نہر ڈیزرٹ برانچ پر واقع بنگلہ کٹڑ والا سے جنوب کی طرف ڈیڑھ کلومیٹر آگے ایک شہر کو ہڑپہ کا مدفن قرار دیا ہے۔ یہ ان مقامات میں سے ایک ہے جن کی چولستان میں کھدائی کی سفارش سر مورٹیمر وھلر نے کی تھی [۳۴]۔

ضلع بہاولنگر میں حاصل ساڑھور سے ۸ میل جنوب میں بستی جیجل ساڑھور کے قریب ایک شہر کے نشانات موجود۔ ہیں یہاں کے لوگوں کی شہادتوں کے مطابق یہ ہر موسم برسات میں شکار کھیلنے کے لئے رائے جچ بھائیا نے تعمیر کرایا تھا [۳۵]۔ آثار و بیانات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ یہ علاقہ اس زمانے میں خوشحال بھی تھا اور متمدن بھی۔ آج بھی بارش ہونے کی صورت میں یہاں کے لوگ سونے و چاندی کے سکے تلاش کرنے کے لئے ان ویرانوں کا رخ کرتے ہیں، مقامی حضرات کے بیان کے مطابق یہاں ایک شاندار محل بھی تھا۔ قلعہ ڈیراوڑ کے قریب جندکھڈ نامی بستی کے نشانات کی اہمیت روایات کے مطابق یہ ہے کہ سکندر اعظم بھی یہاں پہنچا تھا۔ کرنل ٹاڈ اس روایت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سکندر مقدونی ڈنڈ وسار تک پہنچا تھا [۳۶]۔ بہر حال یہ ایک قدیمی شہر کی باقیات ہیں جسکے دامن میں پوشیدہ تاریخ کے وہ اوراق ہیں جنکی تحقیق ہنوز باقی ہے اور جسکا مطالعہ انسانی تمدن کے ارتقائی مراحل میں ہے۔ ''اس علاقے کا کردار'' کے موضوع کو جانچنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی طرح بجنوٹ کے آثارات کے مشاہدات بھی گرانقدر اہمیت کے حامل ہیں۔ کرنل ٹاڈ کے مطابق یہ بستی راجپوتوں کی قدیم آبادیوں میں سے ہے۔ نیز ایک مضبوط حصار والا شہر ایک بلند و بالا اور ناقابل تسخیر قلعہ اور ''دیوی کا مندر کی تعمیر وہ پہلو ہیں جو اسکی اہمیت آشکار کئے ہوئے ہیں [۳۷]۔

پتن منارہ رحیم خان شہر سے قریباً چھ میل جنوب مشرق میں صحرائے چولستان میں صدیوں تک خوشحالی، تمدنی ارتقاء اور عظمت عطا کرنیوالے دریائے ھاکڑہ کے کنارے عظیم ماضی کے ورثہ کا امین ہے۔ جہاں اپنے وقت میں علاقے کی اہم ترین بندرگاہ کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ یہ شہر دریا کے اتصال پر واقع ہونیکی وجہ سے نہایت خوشحال تھا،

لیکن جوں جوں دریا اپنا راستہ تبدیل کرتا گیا شہر کی رونقیں ختم ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ اعلیٰ تہذیبی اور تمدنی روایات کا امین شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوتا گیا۔ یہ شہر میلوں پر پھیلا ہوا تھا۔ درحقیقت محققین کی آراء اور کھنڈرات دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب میں اس سے زیادہ خوب صورت، ترقی یافتہ، وسیع وعریض اور خوشحال شہر کی باقیات دستیاب نہیں ہوسکیں۔ بدھ مت کا عظیم معبد اس شہر کی فن تعمیر کی عمدگی کا مظہر ہے۔ اسی طرح شہر کے مشرق کی جانب بقول کرنل ٹاڈ ہندو مندر کی بلندی و پختگی کے آثار اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ شہر صدیوں تک اپنے ارتقائی مدارج طے کرتا چلا گیا۔ نیز اس شہر کی علمی ساکھ اور مذہبی اہمیت کی عکاسی کے لئے یہ شہادت کافی ہے کہ سندھ بیکانیر اور راجھستان کے راجگان یہاں حاضری دینا سعادت سمجھتے تھے اور وادی سندھ کے تاجر اس مندر میں تجارت کا منافع برکت کے لئے ازخود جمع کراتے تھے [۳۸]۔ الغرض پتن منارہ کے آثارات پر تحقیق مزید سے نہ صرف تمدن کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ انسانی تہذیب کی نمو میں اس علاقے کا کردار بھی ابھر کر سامنے آئے گا۔ کیونکہ پتن منارہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اسکا تذکرہ ۱۵۰ قبل مسیح کے تحریر کردہ یونانی مورخ پٹالمے کے جغرافیہ کے نقشے میں ملتا ہے، محققین کے نزدیک یہ یموسی کیپیل کا دارالحکومت تھا۔ آئین اکبری میں سیوستان کی سرکار کے ذیل میں پتن کا تذکرہ آتا ہے۔ جو اس کو ایک پرگنہ کے طور پر ظاہر کرتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی سومنات کی مہم پر جاتے ہوئے پتن کے مقام سے گزرا تھا۔ سندھ بیکانیر اور جیسلمیر کے ہندو راجہ ۱۸ ویں صدی کے آغاز تک ہمیشہ شیوراتری کا تہوار منانے آتے تھے۔ یاتریوں کی رہائش کے لئے یہاں ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کے وسط میں تالاب پانی اور دودھ سے بھرے رہتے تھے۔ پتن کے متعلق ایک ضرب المثل بھی زبان زدعام ہے۔

''جیدیں سانگے پتن غرق تھیا او چ بھی نہ ھئیں''

وہ جس کی وجہ سے پتن غرق ہوا اور تباہی سے ہمکنار ہوا وہ بھی اس میں نہیں، اس ضرب المثل کے متعلق بہت سے قصے بیان کئے گئے ہیں جس میں قابل ذکر یہ واقعہ ہے کہ:

نواب محمد بہاول خان ثالث کے عہد میں یہاں 'اگر قوم' کا ایک جوگی اس مندر کا رکھوالا تھا۔ جس نے نمک کے ڈھیر میں اپنے آپکو دفن کر کے خودکشی کر لی۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۲۶ء-۱۹۲۷ء میں پتن کا ذکر موجود ہے۔ اس رپورٹ میں بہاولپور گزیٹیئر کے ابتدائی حصہ کو نقل کرنے کے بعد انڈین انکوئری حصہ گیارہ ۱۸۸۳ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں معلوم ہوا تھا کہ یہ پختہ خشتی عمارت جس کا بہت سا حصہ گر چکا ہے ابھی تک ۲۴ فٹ بلند اور ۱۲ مربع فٹ عرض کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن یہ عمارت اب قطعی منہدم ہو چکی ہے۔ صرف اس عمارت کا ایک برج وہ بھی انتہائی خستہ حالت میں باقی ہے [۳۹] جو زبان حال سے اپنی کسمپرسی کی داستان

سنا رہا ہے۔ اسی مقام کے اردگرد بالا تدوا، دروازہ کھوکھومٹو اور پھول ڈودہ کے پرانے مقامات قابل دید ہیں۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں ویرانوں میں بہاولپور کے انجینئر مسٹر حسنی کو ایک سکہ ملا تھا جسکو ماہرین آثار قدیمہ لاہور نے انڈو پارتھین سکہ قرار دیا تھا[۴۰]۔

مدفون بستیوں کے آثارات کے علاوہ محلات، مقبرے جات اور قلعے صحیح حالت میں بھی ہیں اور شکستہ بھی ضلع بھاولنگر میں تحصیل فورٹ عباس میں ایک نہایت قدیم تاریخی قلعہ مروٹ میں بیک وقت بدھ مت، ہندومت اور اسلام کی عبادت گاہوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس قلعہ میں لکشمی دیوی اور رشی واجی کے مندر کی زیارت کے لئے ہندوستان سے زائرین آتے ہیں۔ نیز یہاں پر دگاہ شاہ مردان کی قدر و منزلت مسلمہ تھی اور بلاتفریق مذہب یہاں زائرین آتے تھے۔ مسجد میں نصب ایک پتھر پر فارسی میں تحریر اکبر اعظم کے زمانے کی کندہ ہے۔ اسی جگہ کے مہاراجہ بیکانیر کے محلات بھی اپنے وقت میں شہرت دوام رکھتے تھے۔ لیکن اب نہ وہ محلات ہیں اور نہ وہ عبادت گاہیں جنکا اس زمانے میں شہرہ تھا، البتہ منہدم قلعہ کے پرانے کھنڈرات میں نکاسی آب کے آثارات موجود ہیں۔ نیز جس کی مشرقی جانب ایک دروازے پر پیلے رنگ کے پتھر موجود ہیں جن پر ہندو دور کے بتوں کے نقش موجود ہیں[۴۱]۔

موجودہ قلعوں میں سب سے بہتر حالت مین قلعہ ڈیراوڑ ہے۔ صدیاں گزرنے کے باوجود اسکی ہیبت اور شان وشکوہ قابل دید ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موجودہ قلعہ والئی جیسلمیر راجہ راول رائے سنگھ نے ایک قدیم قلعہ کو منہدم کر کے تعمیر کرایا تھا۔ جسکو نواب صادق محمد خان اول نے ۱۹۴۶ء میں فتح کیا تھا۔ بعدازاں یہ ریاست کا پایہ تخت قرار دیا۔ نتیجتاً اس قلعہ میں نئے خوب صورت محلات تعمیر ہوئے۔ نیز عالیشان دفاتر اور عمال سلطنت کی رہائش گاہیں بھی تعمیر کی گئیں۔ اب اس مقام پر نہ رونقیں ہیں نہ، آبادیاں بلکہ قلعہ کی عمارتیں رو بہ انہدام ہیں۔ البتہ جامع مسجد دھلی کے مانند ایک پرشکوہ مسجد صحیح سالم حالت میں قائم ہے جو کہ نمازیوں کے نہ ہونے پر مرثیہ خواں ہے۔ وضو خانہ ہے لیکن پانی ندارد[۴۲]۔ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسجد کی سیڑھیوں پر ایک پتھر ہے جس پر بالکل واضح بابا غلام فرید کا نام ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جو بابا کے عقیدت مندوں کے لئے نہایت توجہ کا حامل ہو گیا ہے۔ راقم الحروف کو وہاں کے لوگوں نے بتلایا کہ موجودہ نواب صلاح الدین عباسی کے والد نواب عباس کو معلوم ہوا کہ ان کے بزرگوں نے روحانی پیشوا کا نام سیڑھیوں پر ہے تو انہوں نے اسکو وہاں سے اٹھانے کا حکم دیا تو، غلام فرید نے خواب میں آکر منع کیا اور ہدایت کی کہ میرا نام مسجد کی سیڑھیوں پر ہی بہتر ہے۔ مسجد کے سامنے نہایت قیمتی پتھروں اور عالی شان فانوسوں سے مزین شاہی قبرستان ہے جس پر نہایت ماہر سنگتراشوں اور پچی کاروں نے اپنے فن کی نمائش کی ہے جو اس علاقے کے فن تعمیر کے خوب صورت اور نادر شاہ پارے ہیں۔ اسی جگہ ایک احاطے میں چار مزارات ہیں جنکے متعلق روایت ہے کہ ۷۰۶ ہجری میں تبلیغ کے

لئے اصحاب رسولؐ یہاں تشریف لائے اور ہندوؤں نے ان کو شہید کر دیا[۴۳]۔

اس قلعہ کے علاوہ پتن جاند کھانڈا کے کھنڈرات ہیں۔ اسکا تعمیراتی سامان نہایت اعلیٰ معیار کا تھا۔ جو عباسی نوابین نے قلعہ ڈیراور کی توسیع کے وقت استعمال کیا۔ بحر حال چولستان میں قلعہ بجنوٹ تک بارھا مقامات ایسے ہیں جو محققین کے لئے بیش بہا خزانے رکھتے ہیں۔ اسی چولستان میں پھولڑہ تعمیر ۱۱۶۶ھ، دلبھر، جام نگر، یا جام گرہ گڑھ، موج گڑھ، دین گڑھ چنڑوف (تسخیر ۱۱۷۴ھ) ساھنووالہ (تسخیر ۱۲۱۵ھ) نواب کوٹ خیر گڑھ تعمیر، ۱۱۹۸ھ) رکن پور تسخیر (۱۱۷۴)، اسلام گڑھ اور سردار گڑھ (۱۱۷۷ھ) آج محققین کو دعوت تحقیق دے رہے ہیں[۴۴]۔

بہاولپور کے راستے احمد پور جاتے ہوئے سوئی دھار کا قصبہ ہے جہاں بدھ خانقاہ کے نشانات موجود ہیں۔ وہاں تانبے کے سکے ملے ہیں جس سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا کہ مہاراجہ کے تخت نشینی کے ۱۲ سال بعد ۱۳۶ ہجری میں خانقاہ تعمیر ہوئی اسی علاقے کے قرب و جوار میں جا بجا گذشتہ تہذیبوں کے آثارات ملتے ہیں[۴۵]۔ اسی تحصیل احمد پور شرقیہ میں اہم ترین مقام اوچ ہے۔ جو ہزاروں سال سے آباد ہے اور مدینۃ الاولیاء کہلاتا ہے۔ اس علاقے میں برصغیر کی پہلی مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اسی علاقے پر سکندر اعظم کے زمانے سے اہل علم اسکی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے رہے ہیں[۴۶] اور آج بھی بی بی جیوندی کا مزار قابل دید ہے۔

قلعوں کے آثار تو اس قدر واضح نہیں ہیں۔ لیکن سرزمین بہاولپور میں قدیم محلات اپنے صحیح وسالم وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں محل قدیم ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فن تعمیر کے علاوہ اسکی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ ۱۷۴۷ء میں بھاول خان اول نے شہر بہاولپور کی بنا ڈالی لیکن اپنی رہائش ڈیراوڑ میں ہی رکھی۔ البتہ اس دوران گزیٹیئر بہاولپور کے مطابق اس پر بھاول خان ثالث نے احمد پور شرقیہ سے ۳ میل دور ڈیراوڑ کے راستے میں رہائشی عمارات کے لئے ایک وسیع رقبہ منتخب کیا۔ جہاں محل تعمیر کرایا۔ تاریخ مراد میں درج ہے کہ ۱۸۲۸ء میں نواب محمد خان بھاول ثالث نے کچی اینٹوں سے ایک بلند اور طویل فصیل تعمیر کرائی۔ اس میں اپنے لئے ایک شاندار حویلی، عمائدین کے لئے مکانات، خوبصورت باغات، دریا اور جلوس خاص کے لئے ایک پختہ محل اور نہایت عالیشان مسجد بھی تعمیر کرائی۔ اس طرح ایک نیا شہر تعمیر ہوا جو آج بھی قائم ہے۔[۴۷]

شہر بہاولپور کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ہی سرکاری عمارات کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ جو سرکاری دفاتر اور عمال سلطنت کی رہائش، دونوں مقاصد کے لئے تھیں۔ چنانچہ پرانی کوٹھی جس میں آج کل ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا دفتر چیف منسٹر ہاؤس جس میں آجکل پرانی غلہ منڈی ہے۔ نواب کے محل جس میں فوجی دفاتر قائم ہیں اور سنٹرل لائبریری بہاولپور کی خوب صورت عمارات وغیرہ اسی دور میں تعمیر ہوئیں۔ یہ عمارات صحرائی فن تعمیر کی بھرپور عکاسی کرتی

ہیں۔نہایت بلند چھتیں، بہت موٹی دیواریں جو اندر سے کچی ہیں تا کہ گرمی کی شدت سے زیادہ محفوظ کر سکیں۔ بڑے بڑے روشندان، بلند و بالا دروازے آگے پیچھے برآمدے نہایت گہری بنیادیں اور بلند چھتیں نہ صرف خوب صورتی و رعنائی کا سبب ہیں بلکہ پائیداری اور آرام وسکون کا ذریعہ بھی ہیں۔۱۸۷۲ء میں نواب صادق محمد رابع نے بہاولپور کے شمالی جانب بستی ملوک شاہ کے قریب ایک محل تعمیر کرایا اور اس کا نام نور محل رکھا۔ بلور جیسی سفید اور پرکشش عمارت دور سے بقعہ نور نظر آتی ہے۔ یہ محل جو اطالوی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے، وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے، ریاست کے انجینئر مسٹر ہیسن نے تیار کیا تھا اور اس کی نگرانی میں ۱۸۷۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۷۵ء میں بارہ لاکھ روپے کی لاگت سے اسکی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ عمارت کے وسطی حصے میں ایک نہایت وسیع و عریض ہال ہے۔ چھتوں اور دیواروں پر نقاشی کا خوب صورت کام ہے۔ ہال میں ایک اسٹیج بنا ہوا ہے جس پر چاندی کی کرسی بنی ہوئی ہے جو نواب صاحب کے بیٹھنے کے لئے تھی۔ ہال اور دوسرے کمروں کی دیواروں کو والیان ریاست کی تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔ اسی زمانے کی تحریر کردہ عمارت کی مختصر تاریخ آج بھی آویزاں ہے۔ جس کو راقم نے خود پڑھا۔ ۱۸۸۱ء میں نواب صادق محمد خان رابع نے دو لاکھ روپے سے بہاولپور میں ایک اور محل تعمیر کرایا۔ اس کے گرداگرد ایک قلعہ نما دیوار تعمیر کرائی تھی اور دیوار کے ساتھ اندر کی طرف ایک خوب صورت باغ لگایا گیا تھا۔ اس کے جوار میں بگھی خانہ، رتھ خانہ اور توشہ خانہ کی عمارات تھیں اور اس کے ساتھ ہی چار فٹ لمبا اور ایک سو پچاس فٹ چوڑا تالاب تھا جس کے سامنے ایک چھوٹی سی خوب صورت مسجد تھی [۴۸]۔ ۱۹۰۴ء میں نواب بہاول خان خامس نے چند اور محلات تعمیر کرنے کی منظوری دی جن میں گلزار محل، نشاط محل اور فرخ محل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گلزار محل دربار محل کے متصل نہایت خوب صورت عمارات پر مشتمل ہے۔ ان کے کئی دروازے ہیں۔ کمروں کو نفیس فرنیچر اور خوب صورت قالینوں سے سجایا گیا ہے۔ دروازوں پر عنابی رنگ کے مخملی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تمام دیواریں سنگ مرمر کی ہیں چھتوں پر پچی کاری کا کام کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے فانوسوں نے اس کی شان و شوکت میں کافی اضافہ کر دیا ہے۔

والیان ریاست بہاول پور کے محلات میں جس محل کو بالحاظ خوب صورتی اور وسعت و آرائش سب پر فوقیت حاصل ہے وہ صادق گڑھ پیلس ہے جو ڈیرہ نواب میں صادق محمد خان رابع نے ۱۸۸۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس محل کی تعمیر ماہر انجینئروں کی نگرانی میں ہوئی تھی اور اس پر ۱۵ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ تعمیر کا کام تقریباً دس سال تک جاری رہا تھا جس کے پایہ تکمیل کو پہنچنے کے بعد ایک شاندار دربار منعقد کر کے اس کا افتتاح کیا گیا تھا۔ اس محل کے گرد ایک نہایت مضبوط چوڑی اور پختہ فصیل ہے۔ محل کے ہر کونے میں ایک برجی اس طرح بنائی گئی ہے۔ گویا پہرہ دار سپاہی ایوان شاہی کی حفاظت پر مامور ہیں۔ عمارت کے وسط میں نہایت حسین گنبد ہے [۴۹]۔

بہاولپور کے تمام محلات کا بادی النظر میں جائزہ لیں تو جو پہلو بہت نمایاں ہے وہ چاہے اطالوی طرز کا ہو اور خواہ مغربی انداز کا اس میں برجیاں اور گنبد ضرور ہونگے۔

بہاولپور کے آثار قدیمہ کی اہمیت صرف اس حد تک ہی نہیں کہ وہ ہڑپائی اور آریائی تہذیب کا ایک فقید المثال مرکز رہا ہے۔ بلکہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں اس تہذیب وتمدن نے اپنے عروج کی منازل طے کیں جس نے پورے جنوبی ایشاء میں اپنی بالادستی تسلیم کروائی۔ نیز اسی علاقے میں ان بستیوں نے بھی جنم لیا جنکی قدر ومنزلت سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس گزرنے کے بعد بھی ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک مسلّم ہے۔ ایسی بستیاں جنکے باسی شستہ، جنکا معاشرتی نظام ارفع واعلیٰ، حفظان صحت سے مزین اور بنیادی سہولتوں کا حامل تھا۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جنکی بنا پر ساری دنیا کو اپنے قدموں تلے روندنے والا سکندر اعظم اسی علاقے کا اسیر ہوگیا۔ اپنے نام سے شہر آباد کیا اور اس کے ہمراہ اہل قلم اور صاحبان فکر ودانش اس علاقے کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے۔

مدفون بستیوں کے یہ آثارات صدیوں کی دھول ہے جنکو ماہرین آثار قدیمہ کی علم بین نظریں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ یہاں گرانقدر اور دیدہ زیب پرشکوہ محلات، ناقابل تسخیر قلعے اور عظیم المرتبت شخصیات کے مقبرے ابھی تک صحیح یا شکستہ حالت میں موجود ہیں جو اس علاقے کے صدیوں پر محیط فن تعمیر، بادشاہوں، امیروں اور عوام الناس کے رہن سہن اور مروج مذہبی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح بیک وقت آرکیالوجی اور تاریخ کے طالب علموں کو ناقابل تردید دستاویزات کی مدد سے ہزاروں سال پر محیط نسل انسانی کے ارتقائی مدارج کو پڑھنے اور جانچنے کے ذرائع مہیا کرتے ہیں اور اس کرۂ ارض پر اس علاقے کی اس اہمیت تسلیم کروانے کا ذریعہ بنتے ہیں جس سے آج تک مجرمانہ حد تک چشم پوشی ہوتی رہی ہے۔

حوالہ جات

۱) سٹیٹ گزیٹیئر ۱۹۰۴ء بہاولپور، سید محمد اشرف علی، بہاولپور کی جغرافیائی اہمیت، سہ ماہی الزبیر نمبر ۱۹۹۴ء، بہاولپور، ۹، محمد طاہر، خطہ بہاولپور ایک تاریخ ایک سرگزشت، بہاولپور ۲۰۰۱ء، ۱۰۷

۲) ایضاً، ۱۰۰

۳) غلام رسول مہر، تاریخ سندھ، جلد اول، سندھ ادبی بورڈ، ۱۹۵۶ء، ۱۷۳

۴) نورالزماں اوج، بہاولپور تاریخ کے آئینہ میں، الزبیر، بحوالہ سابقہ، ۲۳

۴) معاہدے کی تفصیل کے لئے دیکھئے، محمد اکبر ملک، بہاولپور میں بحالی صوبہ کی تحریک، ایک تجزیاتی مطالعہ، ضمیمہ جات، مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (غیر مطبوعہ)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۲۹۵-۳۰۰

۵) کے۔یو قریشی و دیگر مدیران، پاکستان نقشہ جات، اسلام آباد، ۱۹۷۵ء، ۲۳ (غیر مطبوعہ) و سید محمد اشرف علی، بحوالہ سابقہ، ۱۱

۶) سید شاہد حسن، بہاولپور کی سماجی و تعلیمی تاریخ، مقالہ پی۔ایچ۔ڈی، غیر مطبوعہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۲۰۰۱ء، ۱۸

۷) سید محمد اشرف علی، بحوالہ سابقہ، ۱۱

۸) ایضاً، ۱۲

۹) ایضاً، ۱۲

۱۰) محمد عبید الرحمان، بہاولپور کے آثار قدیمہ، الزبیر، ۱۲۱

۱۱) نور الزمان اوج، بہاولپور سیاحوں کی نظر میں، الزبیر، ۴۴

۱۲) ایضاً

۱۳) ایضاً

۱۴) ایضاً، ۴۵

۱۵) ایضاً، ۴۶

۱۶) ایضاً

۱۷) ایضاً

۱۸) ایضاً، ۴۷، ۴۸

۱۹) ایضاً، ۴۸، ۴۹

۲۰) ایضاً، ۴۹، ۵۰

۲۱) ایضاً، ۵۵، ۵۶

۲۲) ایضاً، ۵۷

۲۳) ایضاً، ۵۹

۲۴) ایضاً، ۶۰

۲۵) صدیق طاہر، وادیٔ ہاکڑہ اور اس کے آثار، بہاولپور، ۱۹۹۳ء، ۳۶

۲۶) صاحبزادہ عبد الرسول، بہاولپور کا عظیم ماضی، الزبیر، آثار قدیمہ نمبر ۲، ۱۹۷۵ء، بہاولپور، ۱۶

۲۷) ایس۔ایم شاہد، قدیم ہند کی تاریخ، دوسرا ایڈیشن، اسلام آباد، ۲۴۸

۲۸) محمد صدیق طاہر، بحوالہ، ۶

۲۹) ایضاً

۳۰) ڈاکٹر رفیق مغل، مقالہ بعنوان وادیٔ سندھ، ۷۔ یہ مقالہ کراچی میں منعقدہ سیمینار میں، ۳ دسمبر ۱۹۷۹ء کو پڑھا گیا۔

۳۱) ایضاً

۳۲) ڈاکٹر حسن دانی کا خط صدیق طاہر کے نام، مکتوب نمبر ۲۔۲۰، ۱۹۷۹ء

۳۳) عبیدالرحمان، بحوالہ سابقہ، ۳۷

۳۴) صدیق طاہر، بحوالہ سابقہ، ۳۷

۳۵) ایضاً، ۹۲

۳۶) ایضاً

۳۷) ایضاً

۳۸) ایضاً، ۲۵، ۲۶

۳۹) عبیدالرحمان، بحوالہ سابقہ، ۷؛ عزیزالرحمان، پتن منارہ، الزبیر، ۷۴۔۷۸

۴۰) محمد عبیدالرحمان، بحوالہ سابقہ، ۱۲۶

۴۱) عزیزالرحمان، فورٹ مروٹ، الزبیر، ۶۹۔۷۲

۴۲) صدیق طاہر، بحوالہ سابقہ، ۱۱۳ و مولوی محمد دین صادق، التواریخ، بہاولپور، ۲۳۔۱۶۰

۴۲) مصنف کی مقامی حضرات سے بالمشافہ گفتگو

۴۳) زاہد علی واسطی، سرزمین بہاولپور، ملتان، ۱۹۹۳ء، ۱۴۱

۴۴) محمد عبیدالرحمان، بحوالہ سابقہ، ۱۲۷

۴۵) پرویز صادق، بہاولپور میں بدھ دور کے آثار قدیمہ، الزبیر، ۱۲۳

۴۶) محمد عبیدالرحمٰن، بحوالہ سابقہ، ۱۲۸

۴۷) شاہد حسن، شاہی محلات، الزبیر، ۱۷۸

۴۸) ایضاً، ۱۸۱

۴۹) ایضاً، ۱۸۲